پہلا انسان اور قرآن

(از جناب مولوی حسین صاحب شور، ایم اے (عثمانیہ)

(۳)

سب سے پہلی بات تو وہی ہے کہ "انسانِ اول" کے متعلق قرآن نے جتنی تفصیل سے کام لیا ہے خود یہ خصوصیت کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "انسانی نظامِ تمدن" کا سارا دارومدار قرآن اسی مسئلہ پر رکھتا ہے۔ اور آپ نے دیکھ لیا کہ یہ مسئلہ کہ انسان عام قدرتی مخلوقات کی طرح پیدا ہوا ہے یا اس کی تخلیق کی جداگانہ نوعیت ہے اس مسئلہ کا ہماری معاشرتی اور تمدنی زندگی پر کتنا اثر ہے۔ سب ہمارے لئے ہیں یا ہم ہی سب کے لئے ہیں یا مصافِ ہستی میں ہماری حقیقت عام کیڑوں مکوڑوں سے زیادہ نہیں ہے یہ سارے معاملات اس پر مبنی ہیں کہ پہلے یہ معلوم ہو کہ ہم کس طرح پیدا ہوئے کہ اسی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم کون ہیں؟ اور اس کے بعد یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ ہمارا تعلق اپنے گردوپیش کے مخلوقات سے کیا ہے؟ لیکن جہاں قرآن نے اس مسئلہ کو اتنی اہمیت دی معلوم ہو چکا ہے کہ اس مسئلہ کے دوراز کار سوالات یعنی انسان کہاں؟ اور کب پیدا ہوا؟ قرآن نے کتنی بے پروائی کے ساتھ اس کو اپنی بحث سے خارج کر دیا۔ بلکہ ان کے مقابلہ میں اس نے صرف ایک ہی سوال کو لیا یعنی انسان کس طرح پیدا ہوا؟ پھر اس سوال کو اٹھا کر اس کے جتنے اہم پہلو تھے انھیں بیان کیا اس میں شبہ نہیں کہ اس کی مثال کسی دوسری مذہبی یادداشت میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ اور اب ان حقائق کی قیمت واضح ہو سکتی ہے جو انسانِ اول کی تخلیق کے سلسلہ میں قرآن نے بیان کیا ہے۔ انتہائی تفصیل کے لئے تو دفتر درکار ہے جس کی ایک مختصر علمی مقالہ میں گنجایش نہیں۔ تاہم اختصاراً ہم چاہتے ہیں کہ ان حقائق کو نمبروار

بحث کیلئے روشنی میں لائیں۔ ناظرین کو چاہئے کہ پھر ایک دفعہ اپنے دماغ میں ان معلومات کو تازہ کرلیں جنھیں قرآن سے نکال کر ہم نے آغازِ رسالہ میں درج کیا ہے تاکہ جن نتائج پر اب ہم بحث کرنا چاہتے ہیں، اس کا قرآن سے تعلق محسوس ہو۔

(۱)

قبل اس کے کہ قرآنِ پاک "انسانِ اول" کی پیدائش کا ذکر چھیڑے اس نے زمین اور اس کی پیداواروں کا تعلق نوعِ انسان سے یہ بتایا

هوالذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً — وہی خدا ہے جس نے تمہارے لئے پیدا کیا ان سب چیزوں کو جو زمین میں ہیں۔

یعنی جس کا مشاہدہ ہو رہا ہے وہی واقعہ بھی ہے زمین اور اس کی مادی پیداوار پر انسانی وجود اور اس کے کمالات کے قیام و بقار کا مدار ہے اور اسی لئے بغیر کسی روک ٹوک کے ہم میں ہر شخص اپنی اپنی وسعت و استطاعت کے اعتبار سے اس سے نفع اٹھا رہا ہے یہی وہ نظریہ ہے جس پر آج ہماری سائنس اور کیمیائی علوم کی بنیاد ہے۔ ایسا آدمی جو دنیا کی چیزوں میں سے کسی ایک چیز کو بھی لغو یا بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کو آدمی کے لئے نہیں سمجھتا قرآن کا مکذّب ہے۔ اور جس نے جب کبھی عالم کی کسی چیز کو بنی نوعِ انسانی کے لئے مفید اور کارآمد ثابت کیا وہی قرآن کا مفسر ہے میں یہ نہیں کہتا کہ جنھوں نے قرآنی آیتوں کا مطلب و معنی ضخیم جلدوں میں بیان کیا ہے وہ مفسر نہیں ہیں ان کی تفسیری احسانات سے کون انکار کرسکتا ہے وہ نہ ہوتے تو شاید ہم قرآن کے پہلے لفظ کا بھی ترجمہ نہ کرسکتے تھے۔

لیکن کہنا یہ ہے کہ اگر یہ لوگ الفاظِ قرآن کے شارح و مفسر ہیں تو وہ جس نے پتھر کے بے کار کوئلوں پر آج ہماری معاشرت کی بنیاد قائم کردی یا جس نے زمین کے اس بدبودار پانی کو جس کا نام کراسن آئیل یا پٹرول ہے اس کو ہماری زندگی کا ایک اہم جزو بنا دیا۔ ایسا آدمی غیر شعوری طور پر قرآن کے اس

نظریہ کا عملی مفسر ہے۔

پھر زمین اور اس کی ساری پیداوار کو انسان میں جذب کرنے کے بعد قرآن نے فضاء کے اس محیط کی طرف توجہ کی جس کا نام مختلف زبانوں میں سماوات، افلاک، سپہر، چرخ، آکاش سکائی۔ وغیرہ ہے یعنی۔

ثم استوٰی الی السماء فسوّٰھنّ	پھر حق تعالیٰ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا اور ان کو
سبع سمٰوات وھو بکل شیٔ	اس نے سات آسمانوں کی شکل میں ٹھیک کیا اور وہ
علیم۔	ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

قرآن کی اس آیت میں گویا ادھر اشارہ کیا گیا ہے کہ نظامِ کائنات کی موجودہ ترتیب میں انسانی وجود بمنزلہ نقطۂ مرکز کے ہے جو اگرچہ سب سے چھوٹا ہوتا ہے لیکن محیط کے سارے دائرے اسی چھوٹے نقطہ پر گردش کرتے ہیں۔ اس لئے کہ محیط کے دوائر اپنی بڑائی میں اتنے عظیم معلوم ہوتے ہیں محض اس سطحی اور ظاہری بڑائی کی بنیاد پر مرکزی نقطہ کے گویا نامحسوس وجود کے مقابلہ میں وہ اہمیت حاصل نہیں کر سکتے۔ پھر وھو بکلّ شیٔ علیم (اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے) فرما کر اس پر تنقید کی کہ مرکز ہو، یا محیط یہ تمام محسوسات ایک نامحسوس "ہویت اور شخصیت" کی قوتِ علمی کے ساتھ وابستہ ہیں یعنی

جو نظر آتے ہیں نہیں اپنے جو ہے اپنا نظر نہیں آتا (امجد حیدر آبادی)

گویا صرف ان چند آیتوں میں اہمیت کے اس معیار ہی کو درہم و برہم کر دیا گیا جو کسی چیز کی جسامت اور ظاہری عظمت کی بنیاد پر قائم کی جاتی ہے قرآن نے چونکایا کہ اس سے آدمی کو دھوکہ نہ کھانا چاہئے بلکہ جو یہاں چھوٹا ہے وہی بڑا ہے اور جو بڑا ہے وہی چھوٹا ہے حتیٰ کہ جو نامحسوس ہے وہی سب کچھ ہے اور جو محسوس ہے وہی کچھ نہیں ہے۔

ٹھیک اس کی مثال انسانی بدن اور جسد کی ہے کہ ہمارے جسم کی سب سے طویل و عریض

چیز جس کا نام کھال ہے اور ہمارے نظامِ جسدی کا وہ پہاڑ جس کا نام ہڈی ہے یا وہ ندیاں یا نالے دریا یا سمندر جن کے نام شرائین ورباطات یا رگیں وغیرہ ہیں اگرچہ جسامت ودبازت میں کتنے بڑے ہیں لیکن دل، جگر، گردے، دماغ، آنکھیں جیسی حقیر ہستیوں کے مقابلہ میں ان بڑوں کی کیا قیمت ہے حتیٰ کہ اسی نظام میں شعور کا وہ نامحسوس نقطہ ہے جسے سب جانتے ہیں۔ لیکن کسی کو وہ محسوس نہیں ہوتا اور جس پر اس کائناتِ جسدی کا سارا دارومدار ہے کیا یہ سارے محسوسات اس نامحسوس نقطۂ شعور کے مقابلہ میں ٹھہر سکتے ہیں؟ ان بڑوں میں سے کسی بڑے جزر کو مثلاً ٹانگ یا ہاتھ کو غائب کرو پھر دیکھو کہ ہمارا یا ہمارے اس شعوری نقطہ کا کیا بگڑتا ہے؟ لیکن جونہی کہ شعور کا یہ غیر مرئی نقطہ کسی نہ کسی طرح محو ہوجاتا ہے کیا اس کے بعد پھر یہ نظام اپنے کو برقرار رکھ سکتا ہے؟

(۲)

ان تنبیہات کے بعد خودبخود یہ سوال دماغوں میں پیدا ہوجاتا ہے کہ محیط ہستی کے اس قلزمِ ذخار میں انسانی وجود کی یہ اہمیت کیوں ہے؟ اسی کا جواب ہے جسے قرآن

واذ قال ربك للملٰئكة انی	اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا۔ کہ میں بنانیوالا
جاعل فی الارض خلیفہ۔	ہوں زمین میں ایک خلیفہ

کے الفاظ میں دینا چاہتا ہے۔ اس حصہ میں قرآن کا خطاب ان لوگوں سے نہیں ہے جو عالم میں تدریجی کمالات کے ظہور کا نقطہ بجائے ہستی کے نیستی کو فرض کرتے ہیں یا جو صفر سے عدد پیدا کرتے ہیں بلکہ اس کے سامنے صرف وہی دماغ یا وہی عقول ہیں جو محسوس عالم کے لئے ایک نامحسوس رب کا وجود ناگزیر قرار دیتے ہیں یعنی خدا کو مانتے ہیں۔

اسی طرح اپنے اس بیان میں اس کا روئے سخن ان لوگوں کی طرف بھی نہیں ہے جن کو عالم کے اس زندہ نظام میں موت کے سوا کسی جگہ کچھ بھی نظر نہیں آتا بلکہ اس نے خطاب کو بنی آدم کی اس کثرت

تک محدود رکھا ہے جو عالم کے اس زندہ نظام کی ہر شاخ کو زندہ ہستیوں کے ساتھ وابستہ سمجھتے ہیں جن کا نام مختلف زبانوں میں دیوتا، فرشتہ، سروش، رب النوع۔ عقول یا ملائکہ ہے اور جس کو ہر زمانے میں انسانوں کے ہر طبقہ نے ہر قسم کی نیکیوں اور خیرات کا سرچشمہ خیال کیا ہے گویا ان سے زیادہ پاک مطہر وجود سلسلۂ کائنات میں کسی کا نہیں ہے حتی کہ اسی پاکی اور تقدس نے بالآخر غلو کا رنگ بعض دماغوں میں اس حد تک اختیار کیا کہ انھوں نے ان کو پوجنا شروع کر دیا۔

اب اس سوال کا جواب دینے کے لئے کہ انسانی وجود محیطِ ہستی کا مرکزی نقطہ کس طرح قرار پایا قرآن "انسانی آفرینش" کا بیان شروع کرتا ہے اگرچہ اس بیان کا حاصل بھی وہی ہے جو دوسرے مذہبی نوشتوں کا خلاصہ ہے یعنی یہ کہ انسان خالقِ کائنات کی تخلیقی کارفرمائیوں کے عام قانون کے تحت پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی آفرینش کی نوعیت کائنات کی دوسری ہستیوں کے مقابلہ میں جداگانہ ہے۔ لیکن قرآن نے اس بیان میں جو اضافے کئے ہیں ان سے انسانی قیمت اور اہمیت پر جتنا اثر پڑتا ہے دوسری کتابوں کے بیان سے یہ اثر نہیں پیدا ہوتا۔

قرآن کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ یوں تو قدرت اپنے عام قانونِ تخلیق کے تحت ایجاد و اظہار میں مصروف ہی تھی کہ اپنے خاص وقت میں نظامِ کائنات کے مرکزی موجودات یعنی جن کے ساتھ عالم کی مختلف چیزوں کی تربیت و نگہبانی متعلق تھی جن کا نام ملائکہ ہے۔ ان سب کو مخاطب کیا گیا اور کہا گیا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ ارادۂ تخلیق میں ملائکہ کو مخاطب کرنا یہ پہلا امتیاز ہے، جو "انسانی وجود" کو کائنات کی دوسری چیزوں پر حاصل ہوا، مخاطب کرنے والا ربِ قدوس ہے اور جن کو مخاطب کیا گیا وہ حجر و شجر نہیں ستارے سیارے نہیں، جمادات نباتات نہیں بلکہ ان تمام موجودات کا نوعی نظام جن زندہ ہستیوں کے ساتھ وابستہ ہے گویا جو ان کے لئے بمنزلہ روح اور جان کے ہیں ان کو تخلیقِ انسانی کے ارادہ سے مطلع کرنے کے لئے مخاطب بنانا اس بات کا اعلان ہے کہ اب جو پیدا کیا جائیگا اور تخلیقی

قوت کا جو مظہر بنے گا اس کی حقیقت عالم کی تمام چیزوں سے بالکل علیحدہ ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ایسا نہ ہوتا بلکہ انسان بھی اس خاموش عملِ تخلیق کے تحت بن کر کھڑا ہوتا جس طرح آئے دن مختلف مخلوقات وحیوانات ونباتات کیڑے مکوڑے دواب وحشرات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ تو انسان آج جو تمام کائنات کو بے تحاشا اپنے قابو میں لاکر اپنی آرزوں اور تمناؤں کی تکمیل کر رہا ہے ہم لوگ اس مشاہدہ اور واقعہ کی کوئی صحیح توجیہ نہیں کرسکتے تھے اور اب جا کر آیت کے حصہ "اذ قال ربّك للملائكة" کا مقصد واضح ہوتا ہے۔

(۳)

اس مذاکرہ میں دو نامحسوس قوتوں یعنی رب اور ملائکہ کے باہمی تخاطب کا ایک ذیلی اثر دماغوں پر خود بخود یہ مرتب ہوتا ہے کہ کسی چیز کی اہمیت ومرکزیت کے لئے اس کا محسوس ہونا اور محسوسات میں بھی جسامت اور طول وعرض میں بڑا ہونا غیرضروری ہے۔ آخر جو لوگ خدا کو مانتے اور خدا کے فرشتوں اور دیوتاؤں کو مانتے ہیں کیا محسوسات کے اتنے لمبے چوڑے نظام کو نامحسوس قوتوں میں گم نہیں کرتے پھر اگر ان ہی لوگوں کے آگے چھوٹے انسان کو اس بڑے عالم کا مرکزی وجود ٹھیرایا جاتا ہے تو اس کے ماننے میں ان کو کیا دشواری پیش آسکتی ہے۔ اگر ایسا صرف ایک خدا ہی ہوتا تو کہہ سکتے تھے کہ ایک کی حد تک ممکن ہے کہ ذہنِ انسانی استثناء کے قانون کو استعمال کرے لیکن خدا ہی نہیں بلکہ جب ہر محسوس وجود کا مرکز نامحسوس قوت کو ٹھیرایا گیا اس سلسلہ میں اگر انسان بھی اسی پوزیشن کا مالک ٹھہرایا جاتا ہے تو اس کے نہ ماننے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے

(۴)

انسانی وجود کی اہمیت کا یہ تو ابتدائی دیباچہ تھا اب اصل حال سے مطلع کیا جاتا ہے کہ میں کس چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ میں "خلیفہ" کو پیدا کرنا چاہتا ہوں، گویا انسان، بشر وغیرہ تو اس کے ثانوی نام ہیں ورنہ اس مخلوق کا جس کے خالق کے ارادہ سے ملائکہ بے خبر کئے گئے اس کا اصلی نام "خلیفہ"

ہے جس میں اس کے سارے کمالات کی شرح پوشیدہ تھی اور ان سارے سوالات کا جواب مستور تھا جو انسان کی مرکزیت کے متعلق قلوب میں پیدا ہو سکتے تھے بتا دیا گیا کہ وہ "خلیفہ" یعنی جانشین ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جانشین کے لئے ضرور ہے کہ وہ کسی کی جگہ ہو، لوگ اس تلاش میں سرگرداں ہیں کہ انسان کس کا جانشین بنایا گیا؟ حالانکہ بات بالکل کھلی ہوئی تھی کہ حق تعالیٰ نے ابتک غیب سے جن مخلوقات کو عالم شہادت میں بھیجا تھا غیب میں ان کی نمائندگی ملائکہ کرتے تھے گویا اس وقت تک عالم میں جتنی چیزیں تھیں ان میں ہر ایک کسی نہ کسی ملک کے ساتھ وابستہ تھیں لیکن شہادت کی وہ ہستی جس کا نوعی وجود بجائے ملک کے خود مالک کی خلافت سے ممتاز تھا وہ انسانی ہستی تھی۔ یا یوں کہو کہ انسان کے سوا جتنے تھے وہ مجبور مخلوقات تھے ان میں مطلق العنانی اور مختار کل ہونے کی شان نہ تھی اب ارادہ یہ تھا کہ عالم شہادت میں خود خدا کی جگہ ایک "مخلوق" پیدا ہو، گویا وہ اس خدا کی جو غیب میں ہے اور نامحسوس ہے غیر مرئی ہے اس کی عالم شہادت اور دنیائے محسوس میں نمایندگی کرے جو کچھ ہم مشاہدہ کر رہے ہیں قرآن توثیق کرتا ہے کہ یہی واقعہ بھی ہے یعنی سارے عالم پر انسان جس شان کے ساتھ متصرف اور کارکن ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے سب اس کے خادم اور یہ سب کا آقا معلوم ہوتا ہے یہ جو کچھ معلوم ہو رہا ہے یہی واقعہ بھی ہے اور سچ یہ ہے کہ "مشاہدات" ہی اگر "واقعات" نہ ہوں گے تو کیا واقعات وہ ہوں گے جن کو نہ کسی نے دیکھا اور نہ سنا۔ زیادہ سے زیادہ ان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ کبھی کبھی لحاف میں منہ لپیٹ کر حقائق و تجربات سے آنکھیں بند کرنے کے بعد یوں ہی بلاوجہ یعنی دلوں میں وسوسہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ قبضہ غاصبانہ تو نہیں ہے۔

(۵)

اب لفظ خلیفہ کے نتائج پر غور کرنا چاہئے۔ انسان کے متعلق کتنا عظیم مغالطہ پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اور جن لوگوں نے بجائے یقینیات کے صرف اوہام و خیالات کے اندھیرے میں انسان کی پوزیشن کو متعین کرنا چاہا ان میں بعضوں کا ذہن تو اس احتمال کی طرف گیا بھی اگرچہ اس کی بنیاد کسی مشاہدہ پر نہ تھی لیکن آخر انھوں نے

کہا کہ آدمی جانوروں کا وارث اور خلیفہ ہے آج اُس لفظ کی قیمت پیدا ہوئی جب قرآن نے اعلان کیا کہ "انسان مخلوقات کا نہیں بلکہ خود خالق تعالیٰ جل مجدہٗ کا خلیفہ ہے"۔

(۶)

پھر اس کی تشریح کے لئے کہ انسان خدا کا خلیفہ کس طرح بنا، اب قرآن اپنے بیان کو آگے بڑھاتا ہے وجودِ انسانی کے متعلق یہ سنکر کہ وہ "خلیفہ" ہے نہ صرف ملائکہ کو بلکہ ہر اس شخص کو جو اس کی قامت کی کھتری سے قطع نظر کرکے اس کی خلافت اور خلافت کی وجہ سے اس کے اندرونی اقتدارات و اختیارات کا اندازہ لگا سکتا ہو اس کو زیادہ سے زیادہ انسان کے متعلق یہی خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اگرچہ ایک جانور اور حیوان ہے لیکن اپنی ذہنی اور دماغی طاقتوں کی بلندی کی وجہ سے اس کو تمام حیوانات کے مقابلہ میں امتیاز حاصل ہے لیکن یہ امتیاز کیا ہے؟ جنھوں نے انسان کو اسی مقام سے دیکھا جس مقام سے اسوقت ملائکہ دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے اس کو ایک ایسا حیوان قرار دیا جو اپنی بقا کے لئے اپنے سے کمزور اور ضعیف ہستیوں کو فنا کرتا ہے۔ اور اس کی دو ہی شکل ہیں کبھی تو اپنے مقابل کے صفات کو کمزور کرکے مقصد حاصل کیا جاتا ہے یعنی اس کی حیثیت کو بگاڑ دیا جائے اس کو فساد کہتے ہیں، یا اس کو سرے سے فنا کے گھاٹ اُتار دیا جائے اسی کا سفک دما و خون ریزی نام ہے۔ ملائکہ نے بھی یہی کہا کہ

اتجعل فیھا من یفسد فیھا — کیا تو زمین میں ایسی ہستی پیدا کریگا جو اس کے اندر فساد پھیلائے

ویسفك الدماء — اور خوں ریزی کرے۔

اور یہی اس زمانہ تک ان لوگوں کی رائے ہے جو انسان کو ایک ایسا ترقی یافتہ حیوان قرار دیتے ہیں جو تنازع للبقاء کے میدان میں فساد اور سفکِ دماء (خونریزی) کرنے کیلئے پیدا ہوا ہے مگر ظاہر ہے کہ انسان یہ نہ تھا اگرچہ اس کے ظاہر حال کے لحاظ سے یہ مغالطہ پیدا ہوتا تھا قرآن نے شروع ہی میں اس مغالطہ کا پردہ چاک کرنے کے لئے اعلان کیا کہ جو ایسا سمجھتے ہیں وہ غلط سمجھتے ہیں بلکہ ملائکہ نے

انسان کے متعلق اپنے مغالطہ کو ظاہر کرتے ہوئے مخلوقاتِ الٰہیہ کی فضیلت کا جو آخری معیار قرار دیا اور اپنے کو اس معیار کا مظہر ٹھیرایا۔ فضیلت کے اسی معیار کو سامنے رکھکر خدا نے متنبہ کیا کہ دراصل اس معیار پر بھی بدرجہ کمال جو اترتا ہے وہ انسان ہی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ملائکہ نے فضیلت اور بڑائی کا معیار یہ بتایا کہ جو ہستی جس حد تک حضرتِ حق سبحانہ تعالیٰ کے کمالات کی نمائش اپنے وجود سے کرے گی وہی مصافِ ہستی میں سب سے برتر ہے کہ ایجادِ عالم کی آخری غرض اگر کچھ ہو سکتی ہے تو یہی ہو سکتی ہے اسی بنا پر انھوں نے "نحن نسبح بحمدك ونقدس لك" کہا۔ یعنی آپ کے محامد و اوصاف اور خود آپ کی ذات نقائص و عیوب سے منزہ اور پاک ہے اس کی نمائش ہم سے ہو رہی ہے۔ اور اس کا اعتراف ہم کر رہے ہیں۔ اور یہی مقصودِ تخلیق ہے نہ کہ اپنے کو زندہ رکھنے کیلئے دوسروں کو مارنا، یا اپنی زندگی کے لئے دوسروں کی موت اپنی بقاء کے لئے دوسروں کے فنا کی کوشش جو تنازع للبقاء کے اس مقصد کو ادا کرتا ہے وہ آخر فطرت کی کس ضرورت کی تکمیل کرتا ہے۔ بڑے چھوٹوں کو نگلتے جائیں آخر اس کا سلسلہ کہاں ختم ہوگا؟ کس پر ختم ہوگا؟ اور آخر اس کا کوئی نتیجہ نکلیگا بھی یا نہیں؟ انسانی وجود کا مقصد اگر صرف اسی قدر ہے تو اس سے بڑھکر لایعنی وجود اور کس کا ہو سکتا ہے۔

قرآن نے ملائکہ کے پیش کردہ معیارِ فضیلت کو مان کر اس کے بعد ایک خاص پیرایہ میں اس راز کا انکشاف کیا کہ انسان سے بڑھکر اس معیار پر کوئی اور کامل اور مکمل ہو کر نہیں اتر سکتا۔

(۷)

سب سے پہلی بات تو یہ بتائی کہ انسانی حقیقت میں حقتعالیٰ کے شاگرد اور متعلم ہونے کی صلاحیت ہے اور اسی تعلیم کی راہ سے وہ ان غلطیوں کی اصلاح کر سکتا ہے جس کا اندیشہ اس کی خلافت اور اسکے اقتدار و اختیار کی وسعت کی بنا پر کیا جاتا تھا یعنی یہ کہ اگر وہ اپنے اختیارات کو غلط طریقہ سے استعمال کریگا تو اس وقت بلاشبہ وہ زمین میں فساد اور خونریزی کا باعث ہوگا لیکن جب اس میں تعلیم الٰہی کے قبول

کرنے کی صلاحیت ہے اور اس ذریعہ سے وہ خدا کی بتائی ہوئی راہ پر اپنے اختیارات کو استعمال کرے گا تو یہ نتائج کبھی مرتب نہیں ہو سکتے۔

(۸)

دوسری بات اس سے بھی زیادہ گہری ہے اس کے سمجھنے کے لئے پہلے چند مقدمات کو پیش نظر کر لینا چاہئے۔

(۱) "نحن نسبح بحمدك ونقدس لك" کی آیت کا مفہوم اولاً متعین کرنا چاہئے ہم دیکھتے ہیں کہ تسبیح کو حمد کے ساتھ متعلق کیا گیا ہے اور تقدیس کو بجائے حمد کے صرف ذات کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ حمد و ستائش کا تعلق چونکہ صفات و کمالات سے ہوتا ہے اسلئے تسبیح بالحمد کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ملائکہ حق تعالیٰ کے کمالات و صفات کو ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک قرار دینے والے ہیں گویا ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم آپ کے صفات و کمالات کی تسبیح کرتے ہیں اور آپ کی ذات کی بھی تقدیس و پاکی بیان کرتے ہیں۔

(۲) اور ظاہر ہے کہ ذات کی تقدیس وہی کر سکتا ہے جس کو ذات کا شعور بھی ہو۔ اسی طرح تسبیح بالحمد بھی وہی کر سکتا ہے جس کو صفات کا علم بھی ہو۔

(۳) اسی کے ساتھ یہ بھی مشاہدہ ہے کہ ایک ایسا شخص جو بینائی کی صفت سے محروم ہے اس کو "بینائی" اور اس کے آثار کا سمجھانا تقریباً ناممکن ہے۔ اسی طرح ناممکن ہے جس طرح کسی نابالغ بچہ کو جنسی التذاذ اور اس کے کیفیات کا ذہن نشین کرانا بالفرض اگر مثالوں اور نظیروں سے کوئی بات اس کے دماغ میں اتاری بھی جائے گی جب بھی ان کیفیات کی صحیح حقیقت تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ زیادہ سے زیادہ ان تمثیلات کی راہ سے یہ خیال پیدا کرایا جا سکتا ہے کہ بچہ جنسی تعلقات کی لذتوں کو مٹھائی یا کھیل کود کی لذتوں اور مسرتوں جیسی ایک چیز قرار دے لیکن ظاہر ہے کہ جو لذت مٹھائی کے کھانے سے زبان کو ملتی ہے

اس میں اور جنسی لذت میں کوئی اشتراکی جہت واقعی طور پر موجود نہیں ہے۔

ان مقدمات کو سامنے رکھنے کے بعد اب اس پر غور کرنا چاہئے کہ ملائکہ کے دعوے تسبیح بالحمد و تقدیس کے مقابلہ میں آدمؑ کے متعلق قرآن کا یہ اعلان کہ حق تعالیٰ نے آدمؑ کو اسمار کلہا کا علم دیا تھا ایسے کل اسمار کا جن سے ملائکہ ناواقف تھے اس سے ملائکہ کے دعوی کی تردید کس طرح ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب ملائکہ کو حق تعالیٰ کے تمام اسمار جو اس کی ذات اور صفات کے آئینے ہیں، ان کا علم نہ تھا تو تمام صفات و کمالات اور ذات کے تمام شئون و وجوہ کے لحاظ سے حق تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس وہ کس طرح کر سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ان کی تسبیح و تقدیس ان ہی صفات و کمالات کی حد تک محدود رہ سکتی ہے جن کا ظہور ان کے اندر ہوا تھا۔

بخلاف آدمؑ کے کہ وہ خدا کا خلیفہ تھا آیت "نفختُ فیہ من روحی"[1] کے لحاظ سے حق تعالیٰ کی ذات کا مظہر تھا اور آیت "خلقتُ بیدیّ"[2] (یعنی انسان کو خدا نے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا) جس کا مطلب یہی لیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ کے دونوں قسم کے صفات جلالی و جمالی کا وہ مظہر قرار دیا گیا الغرض وہ تمام صفات و اسمار کا مظہر تھا یعنی خالق تعالیٰ نے اس کی ہستی میں اپنی ذات و صفات سب کا اعتبار فرمایا تھا اور اسی بنا پر تمام اسمار کی تعلیم اس کو جب دی گئی تو وہ ان کا عالم ہو گیا کہ یہ سارے صفات و اسمار بن چکے تھے۔ گویا جس طرح "بینا" کو بینائی کی، سامع کو شنوائی کی، بالغ کو التذاذ نسائی کی اگر تعلیم دی جائے تو اس کے سمجھنے میں اس کو کیا دشواری ہو سکتی ہے اسی لئے آدمؑ پر ان تمام اسمار کا علم منکشف ہو گیا اور جب تمام اسمار و صفات کا علم اس پر منکشف ہو گیا تو بلاشبہ آدمؑ کو اس کا صحیح استحقاق ہے کہ وہ "نحن نسبح بحمدک ونقدس لک" کا دعوی کرے کہ وہی ہر صفت کی کیفیت اور اس کے نقص و کمال سے واقف ہو سکتا ہے۔ بخلاف ملائکہ کے وہ تمام اسمار و صفات کے مظہر ہی نہ تھے۔ اسی لئے ان کو ان کا علم ہی نہیں

---

[1] میں نے آدمؑ میں اپنی روح پھونکی۔ [2] یعنی میں نے آدم کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔

تھا اور نہ حاصل ہو سکتا تھا پس آدم کے مقابلہ میں ان کا یہ دعویٰ اپنی جگہ پر درست نہ تھا۔ اسی لئے جب اسماء کے علم میں ملائکہ نے عجز کا اظہار کیا تو ارشاد ہوا۔

الم اقل لکم انی اعلم غیب السموات	کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ بلاشبہ میں آسمانوں اور زمین کے
والارض واعلم ما تبدون	غیب کی باتوں کو اور جو باتیں تم چھپائے ہوئے ہو اور جو ظاہر
وما کنتم تکتمون۔	کرتے ہو، ان سب کا خوب جاننے والا ہوں۔

جن کا حاصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسماء وصفات اور ان کے مظاہر کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ ہیں جو ملائکہ کے علم سے غائب ہیں جن کی تعبیر قرآن نے "غیب السموات والارض" سے کی اور دوسری وہ ہیں جن سے ملائکہ کا ظاہر و باطن موصوف ہے جس کی تعبیر قرآن نے "اعلم ما تبدون وما کنتم تکتمون" سے کی۔ اب ظاہر ہے کہ ملائکہ کو اگر علم ہو سکتا تھا تو صرف ان ہی صفات کا جن سے ان کا ظاہر و باطن متصف وموصوف تھا لیکن آسمان وزمین اور کائنات کے وہ حصے جو ان صفات واسماء کے مظاہر ہیں ان کا علم ملائکہ کو کس طرح ہو سکتا تھا۔

(۹)

انسانی وجود کی یہی جامعیت تھی جس نے اس کو تمام کائناتی ہستیوں کا مرکز ومرجع بنا دیا کیونکہ جو کچھ دوسروں کے پاس تھا وہ بھی اس کے پاس تھا اور جن سے دوسرے محروم تھے وہ بھی اس کو دیا گیا تھا اور اسی مرکزیت کا اعلان اس واقعہ کے ذریعہ کیا گیا جب خدا نے جمادات، نباتات وحیوانات واجرام و سماوات ہی کو نہیں بلکہ ان ہستیوں کا نظام جن زندہ وجودوں کے ساتھ وابستہ ہے جس کو مختلف مذاہب وملل میں فرشتے، ملائکہ، دیوتا، رب النوع وغیرہ کے ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کو حکم دیا گیا کہ سب کے سب آدمؑ کے سامنے جھک کر اس کی مرکزیت اور عظمت کا اقرار کریں۔

فسجد الملائکۃ کلھم اجمعون	پھر تمام فرشتے جھک گئے آدم کے آگے سب کے سب۔

(۱۰)

لیکن اس کا اقتصار تو یہ تھا کہ کائنات اور اس کے سارے قوانین انسانی ارادے اور خواہشوں سے سرتابی نہ کرتے کہ جو ہستیاں ان موجودات کے لئے بمنزلہ جان کے ہیں وہی جب انسان کے آگے جھکی ہوئی ہیں تو پھر ان کے ساتھ جو وابستہ ہیں ان کی نافرمانی اور طغیانی کے کیا معنی ہو سکتے ہیں حالانکہ بسا اوقات قدرتی قوانین اگر ایک طرف انسانی ارادوں اور خواہشوں کی پابندی کر کے اس کو مسرور کرتی ہیں۔ اسی طرح ان ہی کے متعلق ہمیشہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ انسانی احساسات و ارادات سے متصادم ہو کر اس کو دکھ اور رنج بھی پہنچاتی ہیں۔

اسی کی طرف (غالباً) اشارہ کیا گیا کہ اطاعت اور سجود کے اس عام حکم سے ایک ہستی نے انکار کیا جس کا نام ابلیس ہے۔ لیکن اس نے کس چیز سے انکار کیا؟ قرآن ہی میں دوسری جگہ ہے کہ ابلیس .. کی بغاوتوں کا اور سرکشیوں کا اثر صرف ان ہی انسانوں پر ہو سکتا ہے جنھوں نے انسانیت کے اصل فرائض سے ہٹ کر اپنے وجود کے مقصد کو خالص نہ رکھا یعنی جو اپنے اخلاص کو کھو بیٹھے ہیں۔

اس پر اگر غور کیا جائے تو حاصل یہی معلوم ہوتا ہے کہ قدرت اور اس کے قوانین کی مخالفت انسانی ارادوں اور خواہشوں سے اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ اخلاص سے خالی ہو جائے گویا اس کی جانچ کے لئے کہ کون انسانیت کے صحیح اور فطری مقصد پر صداقت و اخلاص کے ساتھ قائم ہے اور کون اس نقطہ سے ہٹ گیا ہے۔ ایک وجود پیدا کیا گیا جس کا نام قرآن کی اصطلاح میں ابلیس اور شیطان ہے۔ ابلیس نے اطاعت اور سجدہ سے انکار کیا۔ لیکن انسان کی انسانیت کی وجہ سے نہیں کیا ورنہ انسانوں میں جو مخلص و صادق ہیں خود قرآن کا اعلان ہے کہ ان پر اس کو سلطان اور غلبہ نہیں ملسکتا۔

ان عبادی لیس علیہم سلطان بیشک میرے (مخلص) بندوں پر (شیطان کا) غلبہ نہیں ہے۔

پس شیطان نے تو اپنی ناشکری اور جھوٹی بڑائی کی بنا پر انسان کے آگے جھکنے سے انکار کیا

لیکن جس نے اس کو پیدا کیا تھا اس کا فر کے انکار کو مخلص سے غیر مخلص اور صادق سے کاذب کو جدا کرنے کا معیار ٹھیرا دیا۔

(۱۱)

اور یہی نہیں بلکہ شیطان کے منہ سے یہ نکلوا کر کہ کیا میں اس کو سجدہ کروں جس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے "یعنی جو مٹی زادہ ہے" ادھر بھی اشارہ کر دیا کہ جو انسان کو بجائے اندر اور باطن کے صرف باہر سے دیکھکر اس کو بجائے "خلیفۂ حق" ہونے کے "خلیفۂ حیوان" یا "حیوان زادہ" قرار دے گا۔ دراصل وہ اسی آواز کا دہرانے والا ہوگا جو شیطان کے منہ سے نکلی تھی اور یہ کوئی جدید نظریہ اور تجویز نہیں ہے۔ بلکہ ابتدائے آفرینش سے شیطانی فطرت رکھنے والوں کو انسان کے متعلق یہ ابلیسی شبہ پیدا ہوا۔ اور وہی شبہ مختلف تعبیروں کے بھیس میں ان دماغوں میں پیدا ہوتا ہے جو آدمی کی حقیقت کو نہیں بلکہ صرف اس کے استخوانی ڈھانچے کو دیکھتے ہیں۔

(۱۲)

آفرینشِ آدمؑ کے ان واقعات کو بیان کر کے قرآن نے صرف اس مشاہدہ کی توجیہہ ہی نہیں کی، جس کا معائنہ ہم اس دنیا میں کر رہے ہیں یعنی عالم کی تمام چیزوں پر انسانوں کے قابو یافتہ ہونیکے اسباب کا علم جہاں اس بیان سے حاصل ہوتا ہے اس کے ساتھ ضمنی طور پر ان غلط کاروں اور غلط فہموں کے لئے ان واقعات میں تنبیہ بھی تھی جو آگے چل کر انسانی حقیقت کی قدر و قیمت سے غافل ہو کر اس کو اپنے اصلی مقام سے گرا دینے والے تھے۔

آخر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کہاں دنیا کا ایک وہ طبقہ ہے جو انسانی پیشانی کو خالق کے سامنے سے ہٹا کر ہر قسم کی مخلوقات کے آگے رگڑ رہا ہے۔

اور ایک طرف انسانیت کی وہ بلندی کہ قدوسیان عالم ملکوت بھی اس کے سجدے میں

گرے ہوئے ہیں اور دوسری طرف اس کی وہ پستی کہ بجائے مسجود ملائکہ ہونے کے خود دیوتاؤں کے نام سے یہ ملائکہ ہی کے آگے جھکا ہوا ہے اور پھر اسی ذلت پر بس نہیں کیا گیا۔ انسانوں کو خود انسانوں کے آگے بھی گرایا گیا چھوٹوں سے بڑوں کو پوجوایا گیا اور کاش کہ بات اسی پر ختم ہو جاتی مگر وہی جس کے متعلق قرآن نے خبر دی تھی کہ "کلھم اجمعون" ملائکہ اس کے سجدے میں گرے تھے دیکھا جا رہا ہے کہ وہ جانوروں گایوں، ہاتھیوں، سانپوں کے آگے ماتھا ٹیکے پڑا ہوا ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھکر درختوں، پیپلوں بڑوں کے آگے جھکا ہوا ہے تا ایں کہ یہی پستی بالآخر نباتات سے گذر کر جمادات وعناصر آب آتش خاک باد تک پہنچی اور اس کی آخری حد یہ تھی کہ غلاظتوں اور گندگیوں شرمگاہوں تک کو انسان کا معبود و مسجود بنا ہوا پایا گیا۔ پس "سجد الملائکۃ کلھم اجمعون" سے جہاں انسانیت کی بلندی کا اعلان کیا گیا اسی کے ساتھ اس بیان کے ذریعہ سے ان گرے ہوؤں کو بھی اٹھنے کا پیغام دیا گیا جن کے لئے سب کچھ تھا وہی سب کے لئے بنے ہوئے تھے جو سب کے آقا تھے وہی سب کے غلام بنے ہوئے تھے۔

(باقی آئندہ)

تاریخ انقلاب روس

ٹراٹسکی کی مشہور و معروف کتاب "تاریخ انقلاب روس" کا مستند اور مکمل خلاصہ جس میں روس کے حیرت انگیز سیاسی اور اقتصادی انقلاب کے اسباب و نتائج اور دیگر اہم واقعات کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اگر آپ موجودہ روسی نظام کے پس منظر کا صحیح اندازہ کرنا چاہتے ہیں جو آجکل ناتسی بربریت کا شکار بنا ہوا ہے تو اس کتاب کو اپنے مطالعہ میں ضرور رکھئے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے (عہ)

ملنے کا پتہ

"منیجر" مکتبہ برہان" قرول باغ۔ دہلی